محمد اسدؒ

(۱۹۰۰–۱۹۹۲ء)

محمد اسد (لیوپولڈ ویس) ۲، جولائی ۱۹۰۰ء میں آسٹرو ہنگیرین ایمپائر کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نو عمر صحافی کی حیثیت سے عرب دنیا میں تین سال گزارے اور عرب اسلامی تہذیب سے متاثر ہو کر ستمبر ۱۹۲۶ء میں اسلام قبول کر لیا۔ اپنی علمی و فکری سفر کے دوران ان کی دوستی علامہ محمد اقبال سے ہوئی۔ وہ پہلے فرد تھے جنھیں (۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو) پاکستانی شہریت دی گئی اور حکومت کی جانب سے اسلام کی تعمیرِ نو کے شعبے کے سرپرست بنائے گئے۔ آپ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے سفیر بھی رہے اور پاکستان کے دیگر مسلم ممالک کے ساتھ رشتے استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ محمد اسد ۲۳ فروری ۱۹۹۲ء کو انتقال کر گئے۔

بیسویں صدی میں اُمتِ اسلامیہ کے علمی اُفق کو جن روشن ستاروں نے تاب ناک کیا، ان میں نو مسلم محمد اسد (Leopold Weiss) کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اسد کی پیدائش ایک یہودی گھرانے میں ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ ۲۳ سال کی عمر میں ایک نو عمر صحافی کی حیثیت سے عرب دنیا میں تین سال گزارے اور اس تاریخی علاقے کے بدلتے ہوئے حالات کی عکاسی کے ذریعے بڑا نام پایا، لیکن اس سے بڑا انعام ایمان کی دولت کی بازیافت کی شکل میں اس کی زندگی کا حاصل بن گیا۔ ستمبر ۱۹۲۶ء میں جرمنی میں مشہور خیری برادران[1] میں سے بڑے

[1] عبد الجبار خیری اور عبد الستار خیری کی پیدائش بالترتیب ۱۸۸۰ اور ۱۸۸۵ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنی علم دوستی، دنیا بھر میں حریت پسند طبقات سے روابط، سیاسی و سماجی خدمات اور مسلمانوں کی فلاح کے حوالے سے پہچان حاصل کی۔ لبنان، استنبول، روس اور سویڈن سے ہوتے ہوئے یہ دونوں بھائی جرمنی میں رہائش پذیر ہوئے اور متعدد افراد کو اسلام سے روشناس کروایا۔ عبد الستار خیری بعد ازاں ہندوستان واپس آئے اور مسلم لیگ میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کا انتقال ۱۹۴۴ میں ہوا۔ عبد الجبار خیری کو کئی برس بعد ہندوستان آنے کا موقع ملا۔ یہاں ان کے قریبی روابط میں سید ابو الاعلیٰ مودودی بھی شامل تھے۔ باوجود خواہش کے عبد الجبار خیری پاکستان نہ آسکے اور ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔

بھائی عبدالجبار خیری کے دستِ شفقت پر قبولِ اسلام کی بیعت کی اور پھر آخری سانس تک اللہ سے وفا کا رشتہ نبھاتے ہوئے اسلامی فکر کی تشکیل اور دعوت میں ۶۶ سال صرف کر کے بالآخر ۱۹۹۲ء میں رب حقیقی سے جا ملے۔

(۱)

محمد اسد کی داستان محض ایک انسان کی داستان نہیں، ایک تاریخ ساز دور کی علامت اور عنوان ہے۔ ایک بے تاب روح، خطروں کو انگیز کرنے والا ایک نوجوان، ایک تہذیب سے ایک دوسری تہذیب کا مسافر، ایک محقق اور مفکر، ایک سیاسی تجزیہ نگار اور سفارت کار، اور سب سے بڑھ کر قرآن کا ایک مخلص خادم۔ اسد کی چند آراء سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن فکری اور تہذیبی میدانوں میں ان کے مجتہدانہ اور مجاہدانہ کارناموں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اسد نے مسلمانوں کی نئی نسلوں کے افکار کو متاثر کیا اور اسلامی دنیا میں اپنا مقام بنایا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بیسویں صدی میں، مغربی دنیا سے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے اشخاص میں سب سے نمایاں مقام محمد اسد ہی کو حاصل ہے اور بجا طور پر اسے 'اسلام کے لیے یورپ کا تحفہ' قرار دیا گیا ہے۔ ان کے لیے یہ الفاظ ایک دوسرے جرمن نومسلم ولفریڈ ہوف مین (Wilfried Hoffman۔ م: ۲۰۲۰ء) نے استعمال کیے ہیں اور یہ بھی بڑا نادر توارد ہے کہ خود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی چودھری نیاز علی خاں صاحب (م: ۱۹۷۶ء) کے نام اپنے ایک خط میں غالباً ۱۹۳۶ء میں محمد اسد کے بارے میں یہ تاریخی جملہ لکھا تھا: "میرا خیال یہ ہے کہ دورِ جدید میں اسلام کو جتنے غنائم یورپ سے ملے ہیں، ان میں یہ سب سے زیادہ قیمتی ہیرا ہے"۔

محمد اسد سے میرا بھی اوّلین تعارف، سیکڑوں بلکہ ہزاروں نوجوانوں اور طالبینِ حق کی طرح ان کی پہلی کتاب Islam at The Crossroads کے ذریعے ہوا۔ میری اپنی زندگی میں قیامِ پاکستان کے بعد کے دو سال بڑے فیصلہ کن تھے اور ایک طرح سے میں بھی دوسرے

نوجوانوں کی طرح ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک طرف مغربی تہذیب اور مغرب سے اٹھنے والی تحریکوں کی چمک دمک تھی، اور دوسری طرف تحریک پاکستان کا نظریاتی آدرش اور اسلام کے ایک عالمی پیغام اور تحریک انقلاب ہونے کا احساس۔ دونوں کی اپنی اپنی کشش تھی اور میرے جیسے نوجوانوں کا معمّا کہ ع

ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

اقبال کے ایمان افروز کلام اور مولانا مودودی کے دل و دماغ کو مسخر کرنے والے لٹریچر کے ساتھ جس کتاب نے خود مجھے اس دوراہے سے نجات دلائی اور شاہ راہِ اسلام کی طرف رواں دواں کر دیا، وہ اسد کی یہی کتاب تھی۔ اس وقت سے اسد سے ایک گہرا ذہنی اور قلبی تعلق قائم ہوا اور پھر اس وار فتگی کے عالم میں تلاشِ بسیار کے بعد محمد اسد کے جاری کردہ مجلّے عرفات کے شمارے اور صحیح بخاری کے ان کے کیے گئے ترجمے کے پانچ ابواب حاصل کیے اور وردِ جان کر لیے۔ اسٹوڈنٹس وائس (اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا انگریزی ترجمان) کے دورِ ادارت میں محمد اسد سے بھرپور استفادہ کیا اور ان سے ملنے کے لیے بے چین رہا۔ یہ خواہش ۱۹۵۴ء میں پوری ہوئی جب محمد اسد چند دن کے لیے پاکستان آئے۔ کراچی میں سندھ کلب میں میری اور ظفر اسحاق انصاری اور خرم مراد کی ان سے ملاقات ہوئی اور جو تصویر ذہن میں بنائی تھی، اس کے مطابق پایا۔

اس زمانے میں اسد پاکستان کے اقوامِ متحدہ کے مشن سے فارغ ہو چکے تھے اور وزارتِ خارجہ کے افسران سے خاصے بددل تھے۔ انھوں نے یہ ذکر بھی کیا کہ The Road to Mecca (شاہ راہِ مکہ) شائع ہو رہی ہے (بلکہ مجھے فخر ہے کہ اس کا ایک نسخہ انھوں نے مجھے بھیجا جس پر اسٹوڈنٹس وائس میں تبصرہ میں نے ہی لکھا تھا)۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس کی دوسری جِلد لکھنا چاہتا ہوں جس میں پاکستان کی اس وقت کی قیادت پر تنقید بھی ہوگی۔ افسوس یہ جلد شائع نہ ہو سکی اور پتا نہیں اس کے نوٹس یا نامکمل مسودہ کہاں ہے۔ محمد اسد نے میرے نام ایک خط میں بھی دو سال بعد اس کا ذکر کیا تھا۔

محمد اسد کی گم شدہ پونجی میں اس مذکورہ دوسری جِلد کا نامکمل مسودہ یا نوٹس، صحیح بخاری کے کچھ دوسرے ابواب کے بارے میں ان کے نوٹس، اور اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمایندے کی حیثیت سے ان کی تقاریر میری نگاہ میں قابلِ ذکر ہیں اور اب بھی ان کی تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ کم از کم اقوام متحدہ کے ریکارڈ سے ان کی تقاریر کی نقول حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح جو خطوط اور رپورٹیں انھوں نے وزارتِ خارجہ کو اس زمانے میں لکھی تھیں، انھیں بھی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

محمد اسد سے میرے تعلق کی نوعیت ایک استاد اور شاگرد اور ایک ہیرو اور اس کے مشتاق (Fan) کی ہے، جو تعلق ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا تھا وہ 1992ء تک قائم رہا۔ پھر ان سے بارہا ملاقاتیں ہوئیں اور ان کی شفقت میں اضافہ ہی ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں اسلامک کونسل آف یورپ کی لندن کانفرنس میں کونسل کے بانی سر براہ برادرم سالم عزام کے ساتھ مجھے کانفرنس کے سیکرٹری جنرل کے فرائض انجام دینے کی سعادت حاصل ہے اور اس زمانے میں محمد اسد سے ہمہ وقت استفادے کا موقع ملا۔ فکری اعتبار سے میں نے ان کی اپروچ میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی، البتہ اُمت کے حالات سے دل گرفتگی اور مسلمانوں کی قیادتوں سے مایوسی آخری ۳۰ سال میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔

(۲)

عملی دائرہ میں محمد اسد کبھی بھی سرگرم کارکن (Activist) نہ تھے، لیکن فکری اعتبار سے ان کا کارنامہ بڑا واضح ہے اور اس میں چار چیزیں بہت نمایاں ہیں:

پہلی چیز مغربی تہذیب اور یہود عیسائی روایت (Judeo-Christian tradition) کے بارے میں ان کا واضح اور مبنی بر حق تبصرہ و تجزیہ ہے۔ مغرب کی قابلِ قدر چیزوں کے کھلے دل سے اعتراف کے ساتھ مغربی تہذیب اور عیسائی تہذیبی روایت کی جو بنیادی خامی اور کمزوری ہے، اس کا نہایت واضح ادراک اور دوٹوک اظہار ان کا بڑا علمی کارنامہ ہے۔ زندگی کی روحانی اور

مادی خانوں میں تقسیم برائی کی اصل جڑ ہے اور اس سلسلے میں عیسائی روایت اور مغربی تہذیب کا اسے اس کی انتہا تک پہنچا دینے کا انھیں مکمل ادراک تھا۔ اس حوالے سے اپنی زندگی کے کسی بھی دور میں وہ کسی شش و پنج یا الجھاؤ (Confusion) کا شکار نہیں ہوئے۔ مغرب کے تصورِ کائنات، انسان، تاریخ اور معاشرے پر ان کی گہری نظر تھی اور اسلام سے اس کے تصادم کا انھیں پورا پورا شعور و ادراک تھا۔ وہ کسی تہذیبی تصادم کے قائل نہ تھے، مگر تہذیبوں کے اساسی فرق کے بارے میں انھوں نے کبھی سمجھوتا نہ کیا۔ اسلام کے ایک مکمل دین ہونے اور اس دین کی بنیاد پر اس کی تہذیب کے منفرد اظہار کو یقینی بنانے اور دورِ حاضر میں اسلام کی بنیاد پر صرف انفرادی کردار ہی نہیں، بلکہ اجتماعی نظام کی تشکیلِ نو کے وہ داعی تھے اور اپنے اس مؤقف کو دلیل اور یقین کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ اسلام کا یہ جامع تصور ان کے فکر اور کارنامے کا دوسرا نمایاں پہلو ہے۔

ان کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اُمت کے زوال کے اسباب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں جن بنیادی کمزوریوں کی نشان دہی کی، ان میں تصورِ دین کے غبار آلود ہو جانے کے ساتھ، سیرت و کردار کے فقدان، دین و دنیا کی عملی تقسیم، اجتہاد سے غفلت اور رسم و رواج کی محکومی اور سب سے بڑھ کر قرآن و سنت سے بلاواسطہ تعلق اور استفادے کی جگہ ثانوی مآخذ پر ضرورت سے زیادہ انحصار بلکہ ان کی اندھی تقلید شامل ہیں۔ فقہی مسالک سے وابستگی کے بارے میں ان کی پوزیشن ظاہری مکتبِ فکر سے قریب تھی۔ ان کی دعوت کا خلاصہ قرآن و سنت سے رجوع اور ان کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر و تشکیل تھا۔ قرآن ان کی فکر کا محور رہا اور حدیث اور سنت کو وہ اسلامی نشأۃ ثانیہ کی اساس سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے تمام بڑے قیمتی مضامین کے باوصف جن کا موضوع اسلامی قانون، اسلامی ریاست اور مسلمانوں کی اصل ثقافتی شناخت تھا۔ ان کا اصل علمی کارنامہ قرآن پاک کا ترجمہ و تفسیر اور صحیح بخاری کے چند ابواب کا ترجمہ اور تشریح ہے جن کی حیثیت میری نگاہ میں اس دور میں کلاسک کی ہے۔ پھر "روڈ ٹو مکہ" ان کی وہ کتاب ہے جو علمی، ادبی، تہذیبی، ہر اعتبار سے ایک منفرد کارنامہ اور صدیوں زندہ رہنے والی سوغات ہے۔

محمد اسد کے کام کی اہمیت کا چوتھا پہلو، دورِ جدید میں اسلام کے اطلاق اور نفاذ کے سلسلے میں ان کی حکمت عملی، اور اسی سلسلے میں تحریکِ پاکستان سے ان کی وابستگی اور پاکستان کے بارے میں ان کا وِژن اور وہ عملی کوششیں ہیں جو عرفات، قومی تعمیرِ نو کے ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے ان کی نگارشات، ان کی تقاریر اور پھر ان کی دو کتابیں: Islam at the Crossroads اور The Principles of State and Government in Islam ہیں۔ عرفات کے زمانے کے یہ مضامین دورِ حاضر میں نفاذِ اسلام کا وژن اور اس کے لیے واضح حکمتِ عملی پیش کرتے ہیں۔ چند امور پر اختلاف کے باوجود اس باب میں محمد اسد کے وژن اور فکر اور دورِ جدید کی اسلامی تحریکات کے وِژن میں بڑی مناسبت اور یکسانی ہے حالانکہ وہ کبھی بھی ان تحریکوں سے عملاً وابستہ نہیں رہے۔ اس سلسلے میں ایک جرمن مبصر کارل گنٹر سائمن (Karl Gunter Simon) کے مضمون سے ایک اقتباس دل چسپی کا باعث ہوگا جو محمد اسد سے ایک اہم انٹرویو پر مبنی ہے اور جرمن پرچے، Frankfurter Allgemeine Zeitung میں ۱۸ نومبر ۱۹۸۸ء کو ان کے انتقال سے چار سال قبل شائع ہوا تھا:

> احیائے اسلام کے لیے ہمیں باہر سے ماڈل تلاش نہیں کرنے چاہییں۔ ہمیں بس پرانے بھولے ہوئے اصولوں کو تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بیرونی تہذیبیں ہمیں نیا تحرک دے سکتی ہیں لیکن کوئی غیر اسلامی چیز اسلام کے مکمل نمونے کا بدل نہیں بن سکتی، خواہ اس کا ماخذ مغرب ہو یا مشرق۔ اسلام کے روحانی اور اجتماعی ادارے (خود مکمل ہیں ان کو کسی بیرونی مدد سے) بہتر نہیں بنایا جاسکتا۔ اسلام کا زوال در حقیقت ہمارے قلوب کی موت یا دلوں کا خالی ہو جانا ہے...

کیا یہ اخوان المسلمون کا کوئی مناظرانہ موقف ہے؟ یا بنیاد پرستوں کا اعلان، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہوں؟ نہیں، قطعی نہیں۔ یہ جدید بیانات ایک پرانی کتاب میں پائے جاتے ہیں جو ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی، یعنی Islam at the Crossroads۔ یہ محمد اسد کی پہلی کتاب تھی۔

اقبال اس فکر کو ۱۹۱۰-۱۱ء سے پیش کر رہے تھے۔ حسن البنا نے ۱۹۲۸ء میں تحریک الاخوان المسلمون کا آغاز اسی پیغام کے ساتھ کیا۔ سید مودودی نے ۱۹۳۳ء میں ترجمان القرآن اسی کلمے کی بنیاد پر اجتماعی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کے لیے نکالا، اور محمد اسد نے ۱۹۳۴ء میں یہی بات اپنے دل نشین انداز میں کہی۔ دو کا تعلق برعظیم پاک و ہند سے تھا، ایک مصر کے گلزار کا پھول تھا اور ایک یورپ کے روحانی قبرستان کی زندہ آواز۔ لیکن سب ایک ہی بات کہہ رہے تھے، اس لیے کہ ان سب کی رہ نمائی کا سرچشمہ قرآنِ پاک اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھی۔ محمد اسد بیسویں صدی میں اسلام کے نشأۃ ثانیہ کے معماروں میں سے ایک تھے اور انھوں نے مغرب اور مشرق کے فرق کو ختم کرکے اسلام کے عالمی پیغام کی صداقت کو الم نشرح کیا۔

(۳)

محمد اسد کے یہاں پاکستان اور تحریک پاکستان کے اصل مقاصد اور اہداف کا بڑا واضح اِدراک ہے اور آج کی پاکستان کی نام نہاد قیادتوں کے لیے اسد کی تحریروں میں بڑا سبق ہے اور پاکستانی قوم کے لیے عبرت کا پیغام بھی۔ دیکھیے محمد اسد فروری ۱۹۴۷ء میں اپنے پرچے عرفات میں نہایت وضاحت، فکری سلاست اور علمی دیانت کے ساتھ پاکستان کے تصور کو بیان کرتے ہیں۔ ماضی میں اُبھرنے والی بہت سی اصلاحی تحریکوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> تحریک پاکستان اس طرح کی تمام صوفیانہ تحریکوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ یہ کسی روحانی رہ نما پر لوگوں کے اعتقاد سے جذبہ و توانائی حاصل نہیں کرتی، بلکہ اس کا یہ ادراک جو بیش تر معاملات میں ہدایت دیتا ہے، اور علمی حلقوں میں صاف صاف سمجھا جاتا ہے کہ اسلام (پورے نظامِ زندگی کی تعمیرِ نو کی) ایک معقول تدبیر ہے، اور اس کی سماجی و اقتصادی اسکیم انسانیت کو درپیش تمام مسائل کا حل فراہم کرسکتی ہے، اور اس کا واضح تقاضا یہ ہے کہ اس کے اصولوں کی پیروی کی جائے۔ نظریۂ پاکستان کا یہ علمی پہلو اس کا سب سے اہم پہلو ہے۔ اس کی تاریخ کا ہم کھلی

آنکھوں سے مطالعہ کریں تو ہم یہ پائیں گے کہ اپنے اوّلین دور میں اسلام کی فتح کی وجہ اس کی انسان کی فہم، دانش اور عقل عام سے اپیل ہے۔

تحریکِ پاکستان، جس کی کوئی نظیر جدید مسلم تاریخ میں موجود نہیں ہے، ایک نئے اسلامی ارتقا کا نقطہ آغاز ہو سکتی ہے، اگر مسلمان یہ محسوس کریں، اور جب پاکستان حاصل ہو جائے تب بھی محسوس کرتے رہیں کہ اس تحریک کا حقیقی تاریخی جواز اس بات میں نہیں ہے کہ ہم اس ملک کے دوسرے باشندوں سے لباس، گفتگو یا سلام کرنے کے طریقے میں مختلف ہیں، یا دوسری آبادیوں سے جو ہماری شکایات ہیں، اس میں، یا ان لوگوں کے لیے جو محض عادتاً اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، زیادہ معاشی مواقع اور ترقی کے امکانات حاصل کریں، بلکہ ایک سچا اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کے احکامات کو عملی زندگی میں نافذ کرنا۔ (ص ۸۶۳-۸۶۵)

پھر مئی ۱۹۴۷ء میں جب قیامِ پاکستان کے امکانات اُفق پر روشن ہو گئے تھے، قائدِاعظم اور لیاقت علی خاں کی تقریروں اور دعووں کا حوالہ دینے کے ساتھ کس دل سوزی سے پاکستان کی انفرادیت (Uniqueness) کو بیان کرتے ہیں:

جہاں تک مسلمان عوام کا تعلق ہے، تحریکِ پاکستان ان کے اس وجدان کا حصہ ہے کہ وہ ایک نظریاتی برادری ہیں، اس لیے ایک خود مختار سیاسی وجود کا حق رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، وہ محسوس کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کی برادری کا وجود دوسری برادریوں کی طرح کسی نسلی وابستگی یا کچھ ثقافتی روایات کے اشتراک پر مبنی نہیں ہے، بلکہ صرف اور صرف اس حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ اسلام کے نظریۂ حیات سے مشترک وابستگی رکھتے ہیں۔ اور یہ کہ انھیں اپنی برادری کے وجود کے لیے جواز ایک سماجی و سیاسی نظام قائم کر کے فراہم کرنا چاہیے جس میں اس نظریۂ حیات، یعنی شریعت کا عملی نمونہ دیکھا جاسکے گا۔ (ص ۹۱۲)

پھر دیکھیے کہ کس فکری دیانت اور جذبۂ ایمانی کے ساتھ اپنے دل کو چیر کر ملّتِ اسلامیہ پاکستان اور اس کی قیادت کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ پہلے ان کو مغرب کے تجربات سے متنبہ کرتے ہیں کہ تمھیں آزادی ملنے والی ہے، مگر دیکھو محض غیر مسلموں کے اعتراضات اور نفع عاجلہ کے چکر میں نہ پڑ جانا بلکہ اپنے اصل مقصد پر قائم رہنا۔ اس غلط فہمی میں بھی نہ رہنا کہ اسلام تو طویل عرصے کا ہدف ہے اور فوری طور پر وہ کرنے کے چکر میں پڑ جاؤ جو وقتی مصلحت کا تقاضا ہو۔ کہتے ہیں:

> ہم یہ نہیں چاہتے۔ ہم پاکستان کے ذریعے اسلام کو صرف اپنی زندگیوں میں ایک حقیقت بنانا چاہتے ہیں۔ ہم اس لیے پاکستان چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک اس قابل ہو کہ لفظ کے وسیع ترین مفہوم میں ایک سچی اسلامی زندگی بسر کرسکے، اور یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص اللہ کے رسولؐ کی بتائی ہوئی اسکیم کے مطابق زندگی گزار سکے، جب تک کہ پورا معاشرہ شعوری طور پر اس کے مطابق نہ ہو اور اسلام کے قانون کو ملک کا قانون نہ بنائے۔ (ص ۹۱۸)

ایک جملے میں محمد اسد نے پوری تحریک پاکستان کا جوہر اور ہدف یوں بیان کردیا جو مئی ۱۹۴۷ء میں ان کے اس مضمون کے آخری پیراگراف کا حصہ ہے:

> مسلمان عوام وجدانی طور پر پاکستان کی اسلامی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں اور واقعی ایسے حالات کی خواہش رکھتے ہیں جن میں معاشرے کے ارتقا کا نقطۂ آغاز لاالٰہ الااللہ ہو۔ (ص ۹۲۵)

افسوس کہ پاکستان کی سیاسی قیادتوں نے اس اصل منزل کو مفادپرستی اور وقتی مصلحتوں کی تلاش میں گم کردیا۔ محمد اسد کو اس کا بے پناہ قلق تھا۔

(۴)

محمد اسد کی زندگی کے دو پہلو ایسے ہیں جن کا اعتراف نہ کرنا بڑا ظلم ہوگا اور ان میں سے کم از کم ایک میں، مجھے وہ دورِ حاضر میں منفرد نظر آتے ہیں۔ میں نے سیکڑوں نومسلموں کے

حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور ایک بڑی تعداد سے ذاتی طور پر تعلقات رکھنے کی سعادت پائی ہے۔ نوجوانی میں ایک کتاب Islam Our Choice ابراہیم باوانی مرحوم کی دعوت پر مرتب بھی کی تھی اور اس کے لیے بھی بڑی تعداد میں قبولِ اسلام کی سچی داستانوں کو پڑھا تھا۔ ستاروں کی اس کہکشاں میں ایک سے ایک دل نواز شخصیت کی تصویرِ حیات دیکھی جاسکتی ہے اور ہر ہر فرد اسلام کی کسی نہ کسی خوبی کا فریفتہ ہو کر حلقۂ بگوش اسلام ہوا۔ زیادہ کا تعلق اسلام کی تعلیمات اور قرآن کے دل فریب پیغام سے ہے، لیکن محمد اسد کی ایک ذات ایسی ہے جو مسلمانوں سے مسحور ہو کر اسلام کی متلاشی اور پھر اس کی گرویدہ ہوئی۔

دل پر پہلی ہی چوٹ اس وقت لگی جب ۲۳ سالہ یورپی نوجوان عرب دنیا میں ٹرین میں سفر کرتا ہے اور کھانے کے وقت اس کا عرب ہم سفر اس اجنبی کو جانے بغیر اسے کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ خود پسند اور اپنی ذات کے خول میں گم مغربی دنیا کے اس نوجوان کے لیے یہ بڑا عجیب تجربہ تھا۔ پھر جس سے بھی وہ ملتا ہے، جس بستی میں جاتا ہے، جس جگہ قیام کرتا ہے، اسے ایک دوسری ہی قسم کی مخلوق ملتی ہے جن کے باہمی تعلقات، بھائی چارے، محبت اور دکھ درد میں شرکت پر مبنی ہیں۔ عجیب معاشرہ ہے جو مسافر کی قدر کرتا ہے اور مہمان داری کو سعادت سمجھتا ہے۔ جو کھانا کھلا کر بل پیش نہیں کرتا۔

لیوپولڈ ویز کو یہ تجربہ بڑا عجیب لگتا ہے مگر اس کی روح اس دنیا میں بڑا سکون اور بڑی اپنائیت پاتی ہے۔ روح کی پیاس کے لیے یہاں سیرابی کا بڑا سامان ہے۔ یہ کلچر اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ اس جستجو میں لگ جاتا ہے کہ انسانی معاشرے کے اس ماڈل کو بنانے والے عناصر کیا ہیں۔ یہ اسے اسلام اور اس کے حیات بخش پیغام تک لے آتے ہیں۔ تین سال کی صحرانوردی میں وہ اس تہذیب سے دُور ہوتا جاتا ہے جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی، اور اب اس کی آنکھوں کو وہ دنیا بھا جاتی ہے جس میں اب وہ زندگی گزار رہا ہے۔ پھر اسلام، جیسا کہ اس نے ایک جگہ لکھا ہے، اس کے دل میں بس ایک چور کی طرح خاموشی سے داخل ہو جاتا اور پھر اس دل کو اپنا گھر بنالیتا ہے۔ چور کی تمثیل یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ چور چپکے چپکے داخل ہوتا ہے مگر

کچھ لے کر چپکے چپکے نکل جاتا ہے۔ اسلام داخل تو چپکے چپکے ہی ہوتا ہے لیکن کچھ لینے کے لیے نہیں، کچھ دینے کے لیے اور پھر ہمیشہ اسی گھر میں رہنے کے لیے۔

لیوپولڈ وِیز ایک طلسمی عمل کے ذریعے اسی دنیا کا ہو جاتا ہے، جس کی خبر دوسروں کو دینے کے لیے صحافی کے لباس میں وہ ان کے درمیان آیا تھا۔ اب یہاں اس نے نہ ختم ہونے والی دوستیاں استوار کر لی ہیں۔ اب یہاں اس نے اس معاشرے کی ان اقدار کو جو اس کے لیے پہلے بالکل نئی تھیں اپنی شخصیت کا حصہ بنالیا ہے۔ اب اس کے دل کی دنیا میں ایک انقلاب آگیا ہے اور بالآخر وہ چیز جو غیر شعوری طور پر اس کے روح و بدن میں داخل ہو گئی تھی، وہ اسے شعوری طور پر قبول کر لیتا ہے اور کلمۂ شہادت ادا کر کے اس کا پوری دنیا کے سامنے اعلان کر ڈالتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں انسان اسلام کے راستے مسلمانوں میں داخل ہوئے۔ محمد اسد مسلم دنیا کے بیسویں صدی کے گئے گزرے حال میں بھی مسلمانوں کے ذریعے اسلام تک پہنچا اور پھر اسلام کو اس نے اس طرح اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا کہ مسلمانوں ہی کی حالت کی اصلاح کے لیے دل گرفتہ اور سرگرم عمل ہو گیا۔ تبدیلی (Conversion) یا رجوع (Reversion) کی تاریخ کا یہ بڑا دلچسپ اور سبق آموز واقعہ ہے۔

محمد اسد کی زندگی کا دوسرا پہلو جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا، وہ یہ ہے کہ اسد نے صرف اسلام ہی کو قبول نہیں کیا بلکہ عملاً اس نے اسلامی دنیا ہی کو اپنا مسکن بنالیا۔ اس نے مغرب سے دین کا ناتا ہی نہیں توڑا بلکہ جغرافیائی سفر کر کے وہ پھر اس دنیا کا حصہ ہی بن گیا، جس نے اسے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچا۔ وہ امریکا اور یورپ میں بھی رہا، لیکن اس کی روح کو سکون بدوؤں (Bedouin) کی دنیا ہی میں ملتا ہے۔ اس کی آخری شریک حیات پولا اسد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اسد کی روح بدوی (Bedouin) تھی اور صحرا کی دنیا میں وہ سب سے زیادہ اپنے گھر کی طرح ہوتا تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں ہجرت کی اور اپنی اسلامی زندگی کے ۶۶ سال عرب دنیا، ہندوستان، پاکستان اور تیونس میں گزارے، اور آخری ایام میں

اس کا قیام اسپین کے اس علاقے میں رہا جو اندلس اور عرب دنیا کا روحانی اور ثقافتی حصہ تھا بلکہ آج بھی اس کی فضائیں باقی اسپین سے مختلف اور عرب دنیا کے ہم ساز ہیں۔

(اگست ۲۰۰۶ء)